اجتماعی اجتہاد اور قانون سازی

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر*

ڈاکٹر حافظ حسین ازہر*

This paper explains the concept of Islamization of laws and elaborates the history of Islamization of laws through a brief study of classical and modern era of Islamic Jurisprudence. From classical time, three famous efforts are discussed i.e. implementation of Muatta Imam Malik, application of Fatawa Alamgeeri and execution of Majallah al-Ahkam al-Adliyyah. Similarly, from modern era, especially the case of three prominent Muslim countries i.e. Saudi Arabia, Egypt and Pakistan is discussed with detailed history and efforts.

کسی بھی اجتہاد کو قانون بنانے کے لیے کئی مراحل سے گزارنا پڑتا ہے۔معاملہ ایسا نہیں ہے کہ فقہ کی کسی کتاب سے فتاوی لیں، اس کی ترقیم کریں تو قانون تیار ہے۔بلکہ کسی بھی فقہی نص کو تہذیب وتنقیح کے کئی درجات ومراحل سے گزارنے کے بعد قانونی شکل دی جاتی ہے۔ اُستاذ صبحی المحمصانی نے اس عمل کو پانچ مراحل میں تقسیم کیا ہے۔پہلے مرحلے میں ان فقہی مصادر کا انتخاب شامل ہے کہ جن کی بنیاد پر کسی ملک میں قانون سازی ہونی ہے۔عصر حاضر میں مذاہب اَربعہ اور دوسرے معروف فقہی مذاہب کے فتاوی کی کتب کا انتخاب اس مرحلے میں شامل ہو گا۔وہ فرماتے ہیں:

"تدوین کے پانچ مراحل ہیں۔پہلا مرحلہ کسی فقہی مذہب کو اپنا لینا ہے اور یہ بہت ہی مشکل مرحلہ ہے۔ابن مقفع اور اَبو جعفر تو اس میں کامیاب نہ ہو سکے لیکن سلطنت عثمانیہ اور اس کے علاوہ اسی طرز پر بعض دوسرے عرب ممالک نے کامیابی حاصل کر لی ہے۔"(۱)

دوسرے مرحلے میں مختلف فقہی کتابوں اور فتاوی جات کے اختصار پر مشتمل ایک جامع کتاب آسان فہم انداز میں تالیف کی جاتی ہے۔ اُستاذ صبحی المحمصانی فرماتے ہیں:

"دوسرے مرحلے میں بہت سی کتابوں کو ایک جگہ جمع کیا جاتا ہے اور یہ جمع وتالیف سرکاری قانون کی شکل میں نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسی قانونی کتاب کی شکل میں ہوتی ہے کہ جس کا مطالعہ اور تفہیم ججوں، علماء اور طالب علموں کے لیے آسان ہو۔اس کی کئی ایک مثالیں بھی پائی جاتی ہیں مثلاً ملتقی الابحر، فتاوی عالمگیری، سیدی خلیل اور مدونات قدری پاشا وغیرہ۔" (۲)

تیسرے مرحلے پر ان مختصر فقہی عبارتوں کو قانونی اور حکمی شکل دی جاتی ہے تاکہ ان کو قانون کے جدید

* اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس، انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف ویٹینری اینڈ اینیمل سائنسز، لاہور۔

اسلوب میں ڈھالا جاسکے۔ اُستاذ صبحی المحمصانی فرماتے ہیں:

”اس کے بعد تیسرا مرحلہ ہے کہ جس میں کسی ایک فقہی مذہب کو سرکاری حکمیہ عبارات کی شکل میں ڈھالنا ہے جیسا کہ 'مجلۃ الأحکام العدلیۃ' کی مثال ہے جو مذہب حنفی کی بنیاد پر تیار کیا گیا تھا۔“(۳)

چوتھے مرحلے میں، اس صورت میں جبکہ ایک معین فقہی مذہب کو قانون سازی کے لیے اصل بنیاد بنا یا گیا ہو، دوسرے مذاہب اسلامیہ سے بھی استفادہ کرنا شامل ہے۔ اُستاذ صبحی المحمصانی فرماتے ہیں:

” اس کے بعد چوتھا مرحلہ ہے کہ جس میں ایک اور طریقے کو اختیار کرتے ہوئے بعض مسائل میں ایک فقہی مذہب کی عبارتوں کو دوسرے مذاہب کے مقابلے میں اصل اقتباس بنایا جاتا ہے۔اس کی مثال سلطنت عثمانیہ میں عائلی حقوق کا قانون، مجلہ جنایات، تیونس میں قدیم رواجی احکام، مجلہ التزامات، تیونس کے عقود اور بلاد عربیہ کے پرسنل لاء کے مجموعہ قوانین ہیں کہ جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ جیسا کہ ہم ذکر کر چکے ہیں کہ ان قوانین میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ جو شریعت سے کافی دور ہیں جیسا کہ عراق نے وراثت کے بعض مسائل میں قانون سازی کی ہے اور ہم اس بارے میں اسی لیکچر میں خبردار کر چکے ہیں۔“(۴)

پانچویں مرحلے میں دوسرے ممالک کے قوانین سے کچھ اخذ کرنا شامل ہے۔ اُستاذ صبحی المحمصانی فرماتے ہیں: ”سب سے آخری اور پانچواں مرحلہ مغربی قوانین سے کچھ اَخذ کرنا ہے بشرطیکہ یہ استفادہ اسلامی قانون کی روح کے خلاف نہ ہو اگرچہ بعض اوقات وہ اسلامی قانون کے ظاہر اَخلاف نظر آ رہا ہو گا۔“(۵)

فقہی قانون سازی کی کوششوں کا ایک مختصر تاریخی جائزہ

اسلامی تاریخ میں فقہ اسلامی کو قانونی شکل دینے کے لیے کی جانے والی کوششوں میں سے تین بہت معروف ہیں۔ ذیل میں ان پر اجمالی انداز میں روشنی ڈال رہے ہیں۔

مؤطا امام مالک کی تنفیذ

دوسری صدی ہجری میں عباسی خلفاء کے عہد کے آغاز میں ابن المقفع نے عباسی خلیفہ اَبو جعفر منصور کو ایک خط لکھا جس کا لب لباب یہ تھا کہ مختلف مسائل میں علماء کے درمیان اختلاف بہت بڑھ گیا ہے جس کی وجہ سے انتشار پیدا ہو رہا ہے لہذا اس نے اس خط میں عباسی خلیفہ کو جو مشورہ دیا، وہ یہ تھا کہ کسی فقہی مذہب کو بنیاد بناتے ہوئے اَمیر المؤمنین اس کو اپنے حکم سے نافذ کر دیں۔ عبد الرحمن عبد

العزیز القاسم لکھتے ہیں: "جیسا کہ امیر المؤمنین ان دو شہروں اور ان کے علاوہ خلافت اسلامیہ کے دوسرے شہروں اور علاقوں کا حال دیکھ رہیں ہیں کہ ان شہروں میں قصاص، نکاح و زنا اور مالی معاملات کے بارے میں مختلف شرعی احکام کے تعین میں فقہاء و علماء کا اختلاف بہت بڑھ گیا ہے۔۔۔ اس کے بعد ابن المقفع کہتا ہے: اگر امیر المؤمنین چاہیں تو قاضیوں کے ان تمام اختلافی فیصلوں اور طور طریقوں کے بارے میں ایک حکم جاری کریں کہ وہ سب امیر المؤمنین کی خدمت میں ایک کتاب کی صورت میں جمع کیے جائیں کہ جس کتاب میں ان اختلافات کے ساتھ ساتھ سنت و قیاس سے ان کے دلائل بھی موجود ہوں۔ پھر امیر المؤمنین اس کتاب میں غور و فکر کریں اور ہر قضیے کے بارے میں (اس کتاب کی روشنی میں) اپنا ایک فیصلہ جاری کر دیں جو اللہ سبحانہ و تعالی کی طرف سے ان کو الہام ہوا ہو۔ پھر امیر المؤمنین اپنے اس فیصلے پر عزم مصمم کر لیں اور قاضیوں کو اس کے خلاف فیصلہ دینے سے منع کر دیں اور اس طرح سے ایک جامع کتاب ہمارے لیے مرتب کر دیں۔ اس طرح سے ہمیں امید ہے کہ قاضیوں کے یہ مختلف فیصلے، کہ جن میں صحیح بھی ہیں اور غلط بھی، ایک ایسے حکم کی صورت اختیار کر لیں گے جو ہر حال میں صحیح ہو گا۔ ہمیں یہ بھی امید ہے کہ مختلف طور طریقوں کا امیر المؤمنین کے حکم سے ایک جگہ اکٹھا ہو جانا، اجماع امت کے لیے ایک قرینہ بن جائے گا اور پھر یہی کام آخری زمانے کے امام سے بھی ہو گا۔ ان شاء اللہ تعالی!۔"(٦)

ابن المقفع شروع میں ایک مجوسی تھا، بعد میں اس نے اسلام قبول کیا لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد بھی اس کے نظریات وافکار اور اعمال و افعال میں کوئی خاص تبدیلی نہ آئی تھی۔ ابن المقفع ایک معروف ادیب بھی تھا اس نے فارسی لٹریچر کو بھی عربی میں منتقل کیا۔ اس کی معروف کتاب 'کلیلۃ و دمنۃ' فارسی سے ترجمہ شدہ ہے۔ اس نے کل چھتیس برس کی عمر پائی اور مشہور یہی ہے کہ ۱۴۵ھ میں خلیفہ منصور ہی کے ایک حکم پر اس کو قتل کیا گیا تھا۔ بعض مؤرخین نے اس کے قتل کی وجہ اس کے الحاد کو بنایا ہے جبکہ دوسرے گروہ کے علمائے تاریخ کا کہنا ہے کہ اس کا قتل ایک سیاسی تدبیر تھی۔ صورت حال جو بھی ہو، ابن المقفع کییہ خواہش نہ تو پوری ہو سکی اور نہ ہی اسے علماء کے ہاں قبول عام حاصل ہوا۔ علماء و فقہاء کے حلقے میں اس تجویز کے مقبول نہ ہونے کی بنیادی وجہ کیا تھی؟ اس بارے کئی ایک علماء نے وضاحت کی ہے۔ أستاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "یہ تجویز اس وقت کے علماء میں زیادہ رواج نہ پا سکی کیونکہ فقہاء اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگوں کو اپنی

تقلید پر مجبور کریں بلکہ وہ اپنے شاگردوں کو بھی اپنی فقہی آراء کے بارے میں تعصب و تنگ نظری سے منع کرتے رہتے تھے اور وہ اس بات سے ڈرتے رہتے تھے کہ ان کے اجتہاد میں کوئی غلطی نہ ہو جبکہ ان کے یہ اجتہادات کسی وضعی قانون سازی کی بنیاد بھی نہیں تھے۔"(۷)

علماء میں اس تجویز کے مقبول نہ ہونے کے باوجود خلیفہ اَبو جعفر منصور کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی اور جب وہ ۱۴۸ھ میں حج کے لیے تشریف لے گیا تو اس نے مدینہ میں امام مالک سے ملاقات فرمائی اور ان سے یہ درخواست کی:

"بیشک عراق میں علمی مسائل میں بہت زیادہ اختلاف واقع ہوا ہے پس آپ ایک ایسی کتاب جمع کر دیں کہ جس پر آپ لوگوں کو جمع کر دیں تو اس پر امام مالک نے مؤطا لکھی۔" (۸)

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

"اَبو جعفر نے امام مالک سے کہا کہ آپ ایک ایسی کتاب تالیف کریں کہ جس پر ہم لوگوں کو جمع کر دیں۔اس کے ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ اس کتاب کی تالیف کے دوران حضرات عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے شذوذات، حضرت اَبو عمرو رضی اللہ عنہ کی انفرادیت اور حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی رخصتوں سے اجتناب کیجیے گا۔اس پر امام مالک نے اسے کہا: امیر المؤمونین! آپ کے لیے یہ کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو کسی ایسے شخص کے قول پر جمع کریں جو خطا بھی کرتا ہو اور درست رائے تک بھی پہنچتا ہو۔ حق تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے ہی جاری ہوتا ہے اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم مختلف شہروں میں آباد ہو گئے اور ہر شہر کے لوگوں نے اپنے شہر کے مفتی صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتاوی و علم پر اعتبار کیا۔اس طرح ہر شہر کے لوگوں نے، جو ان کے پاس علم پہنچا تھا، اسکے مطابق ایک رائے بنالی۔"(۹)

فتاوی عالمگیری کی تالیف

راجح فقہی قوال کی تدوین کی ایک سنجیدہ کوشش برصغیر پاک و ہند میں مغل بادشاہ سلطان اورنگزیب عالمگیر کے دور میں ہوئی ہے۔اورنگزیب عالمگیر نے علماء کی ایک جماعت کو شیخ نظام الدین کی صدارت میں اس کام پر مامور کیا۔اس فتاوی کی تدوین پر کم و بیش دس لاکھ کا خرچ آیا تھا اور اس میں ایک لاکھ کے قریب مسائل کو جمع کیا گیا ہے۔اس فتاوی میں مسائل کی ترتیب فقہ حنفی کی معروف کتاب 'الہدایۃ' سے لی گئی ہے۔یہ کتاب قانون سازی کے منہج و اسلوب پر نہیں ہے بلکہ اس میں فقہ حنفی کے مفتی بہ اور راجح اقوال کو مختلف ابواب کے تحت جمع کر دیا گیا ہے۔اس فتاوی کی تدوین گیارہویں صدی

ہجری کے آخری ربع میں ہوئی اور اس تکمیل میں تقریباً آٹھ سال صرف ہوئے۔ایک خاص فقہی مذہب کے دائرے میں اجتماعی اجتہاد کی یہ ایک اہم مثال ہے۔ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی صاحب لکھتے ہیں:

"بعد ازاں اورنگزیب عالمگیر (۱۰۶۸ھ۔۱۱۱۸ء) نے علم فتاوی کو عروج پر پہنچا دیا۔عالمگیر خود بھی فقہی اصول و جزئیات پر عبور رکھتے تھے اور علماء و فقہاء کے لیے علمی مجالس کا اہتمام کرتے تھے، انہوں نے شیخ نظام لدین برہان پوریؒ کی سربراہی میں ایک بڑی کمیٹی تشکیل دی جس میں ہندوستان بھر کے چیدہ چیدہ علماء شریک تھے۔مؤرخین نے اس کمیٹی کے ۲۷ یا ۲۸ علماء کے حالات زندگی کو جمع کیا ہے۔فتاوی عالمگیری کا منصوبہ تقریباً آٹھ سال میں مکمل ہوا۔یہ فتاوی بھی حنفی مکتب فکر کی نمائندگی کرتا ہے۔اس میں احناف کی ان آراء کو لیا گیا ہے جو مفتی بہ ہیں۔اگر کسی مسئلہ میں ایک سے زائد اقوال پائے جاتے ہیں اور ان میں کوئی بھی دلائل کی بنیاد پر قابل ترجیح نہیں ہے تو ان تمام اقوال کو بیان کر دیا گیا ہے۔فتاوی عالمگیری عربی زبان میں مدون ہوا تھا، عام لوگوں کے استفادہ کے لیے عالمگیر نے اپنے دور میں ہی اس کا فارسی ترجمہ کرالیا تھا، بعد میں اس کا اردو ترجمہ سید امیر علی ملیح آبادی نے کیا جو فتاوی ہندیہ کے نام سے شائع ہوا۔"(۱۰)

قاضی و جج حضرات مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت اس 'فتاوی' سے رہنمائی تو لیتے تھے لیکن اس کو ملکی قانون کی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی صاحب لکھتے ہیں:

"گیارویں صدی ہجری/سترہویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب عالمگیر نے شیخ نظام کی سربراہی میں مشاہیر علماء کی ایک کمیٹی تشکیل دی تاکہ وہ ایک ایسی جامع کتاب مدون کریں جس میں ظاہر الروایۃ کے وہ تمام مسائل آجائیں جنہیں علماء کا حسن قبول حاصل ہوا ہو۔یہ کتاب جسے فتاوی عالمگیریا" الفتاوی الہندیۃ" بھی کہتے ہیں، فقہ کی متداول کتب کے اسلوب پر ہے۔اگرچہ فتاوی عالمگیری کو نیم سرکاری حیثیت حاصل تھی، لیکن نہ تو یہ کسی مجموعہ قوانین کی طرح واجب العمل رہا اور نہ اسلوب و ترتیب میں یہ مجموعہ ہائے قوانین سے مشابہ ہے، البتہ اس میں ہر مسئلے سے متعلق مفتی بہ اقوال درج ہیں۔۔۔ہندوستان کے عدالتی نظام میں اس کا موثر کردار رہا ہے۔"(۱۱)

مجلہ اَحکام عدلیہ کی تنفیذ

تیرہویں صدی ہجری کے اَخیر میں سلطنت عثمانیہ میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ فقہ کی ضخیم کتب کا خلاصہ نکال کر اسے جدید اسلوب میں ایک قانونی ضابطے کی شکل دے دی جاتا کہ قاضیوں کے لیے فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔اس مقصد کے پیش نظر ایک ضابطہ دیوانی مدون کیا گیا جس

کا نام 'مجلۃ الأحکام العدلیۃ' ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار اس 'مجلہ' کی تدوین کی غرض و غایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "جدید قائم کردہ دنیاوی عدالتوں (نظامیہ) کو اکثر اوقات عام دیوانی قانون کے معاملات کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے، لیکن ججوں کو عام طور پر علم فقہ سے پوری واقفیت حاصل نہیں ہوتی، اس لیے یہ قرین مصلحت سمجھا گیا کہ مذہبی عدالتوں کے صدر ہی کو بیک وقت ان دنیاوی عدالتوں کا صدر بھی مقرر کیا جائے۔ یہ انتظام تسلی بخش ثابت نہ ہوا، اس لیے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ قانونی معاملات کے متعلق ضروری امور کو ایک ضابطہ کی صورت میں تشکیل دے دیا جائے جس کا آسانی کے ساتھ مطالعہ کیا جا سکے اور اس کے مقابلے میں فقہ کی ضخیم کتابوں کے دیکھنے کی ضرورت نہ رہے۔"(۱۲)

اس ضابطہ دیوانی کی تکمیل و تدوین ۱۲۸۵ھ تا ۱۲۹۳ھ کے مابین ہوئی ہے اور اس کو سات علماء پر مشتمل ایک کمیٹی نے مکمل کیا ہے جس کے صدر أحمد جودت پاشا تھے۔ اس ضابطہ کو شعبان ۱۲۹۳ھ میں سلطانی فرمان کے ذریعے دولت عثمانیہ کی تمام عدالتوں میں نافذ کر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی لکھتے ہیں:

> "سرکاری سطح پر جو نسبتاً وقیع کوشش ہمیں نظر آتی ہے، وہ حکومت عثمانیہ کے مجموعہ قوانین مدنی 'مجلۃ الأحکام العدلیۃ' کی ہے۔ حکومت عثمانیہ نے أحمد جودت پاشا ناظم محکمہ أحکام عدلیہ کی زیر صدارت ایک سات رکنی مجلس قائم کی۔۔۔ مجلس نے تقریباً نو سال کی محنت کے بعد ۱۲۹۳ھ میں مجلۃ کی تالیف مکمل کی جو سلطان ترکی کے حکم سے جاری کر دیا گیا۔"(۱۳)

لیکن اس کے باوجود یہ مجلۃ تمام معاملات میں واحد سند نہیں تھا بلکہ قاضیوں کو یہ اجازت تھی کہ وہ فقہ حنفی کی دیگر کتب کا مطالعہ کر کے کسی قضیے کا فیصلہ کریں اور انہوں نے اس اجازت کو استعمال بھی کیا ہے۔ اردو دائرہ معارف اسلامیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

> "لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مجلہ بھی تمام معاملات متعلقہ کے لیے واحد سند تھا۔ قاضیوں کو اس معاملہ میں پوری آزادی حاصل تھی کہ حنفی فقہ کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد اپنے نتائج کا استنباط کریں اور یہ آزادی فی الحقیقت استعمال بھی کی جاتی رہی۔"(۱۴)

دور جدید میں فقہی قانون سازی کی تاریخ

دور جدید میں مختلف اسلامی ممالک نے انگریزوں، فرانسیسیوں، اتحادیوں اور جاپانیوں سے

آزادی حاصل کرنے کے بعد اپنی ریاستوں میں اسلامی قانون سازی کی طرف قابل قدر نہ سہی لیکن کسی قدر پیش رفت کی ہے۔ مصر، ایران، عراق، اردن، شام، انڈونیشیا، ملائیشیا، سوڈان، مراکش، تیونس، لیبیا، افغانستان، سعودی عرب اور پاکستان میں اس معاملے میں خاصی پیش رفت ہوئی۔ ذیل میں ہم عالم اسلام کے تین نمائندہ ممالک مصر، سعودی عرب اور پاکستان میں اسلامی قانون سازی کے حوالے سے ہونے والی سیاسی و آئینی جدوجہد کا ایک مختصر جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

مصر میں قانون سازی کی تاریخ

دوسری صدی ہجری میں امام شافعی نے مصر کو اپنے جدید مذہب کی نشر و اشاعت کے لیے منتخب کیا اور قاہرہ ہی میں ۲۰۴ھ میں وفات پائی۔ فاطمی اسماعیلی خلفاء کے دور میں مصر کی عدالتوں میں شافعی مذہب کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی (۱۱۳۸ تا ۱۱۹۳ء) نے مصر پر حملے کر کے اسماعیلیوں کی حکومت ختم کر دی اور ایوبیہ خاندان کی حکومت قائم کی۔ حکومت ایوبیہ کے دور اقتدار میں بھی شروع شروع میں فقہ شافعی ہی کا غلبہ رہا، جبکہ بیبرس نے اپنے زمانہ اقتدار (۱۳۰۸ تا ۱۳۰۹ء) میں چار قاضی حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی مقرر کیے لیکن ان میں بھی قاضی شافعی کو ترجیح ہوتی تھی۔ دولت عثمانیہ کے نویں سلطان سلیم اول نے اپنے زمانہ خلافت (۱۵۱۴ تا ۱۵۲۰ء) میں مملوک سلاطین کی اڑھائی سو سالہ حکومت ختم کر کے مصر پر قبضہ کر لیا۔ دولت عثمانیہ کے دور میں مصر میں حنفی فقہ کے مطابق فیصلے ہوتے رہے۔

اسماعیل بن ابراہیم پاشا (۱۸۳۰ تا ۱۸۹۵ء) نے ۱۸۶۳ء میں مصر کی حکومت سنبھالی اور سلطنت عثمانیہ کے حکمران سلطان عبد العزیز (۱۸۶۱ تا ۱۸۷۶ء) کی طرف سے اسے 'خدیوی' کا خطاب دیا گیا۔ ۱۸۷۴ء میں مصر کے حاکم اسماعیل پاشا کی طرف سے ایک فرمان جاری ہوا جس کے مطابق مصر عدالتی اور انتظامی لحاظ سے پوری طرح آزاد ہو گیا۔ مفتی سید عبد القیوم جالندھری لکھتے ہیں:

> "اسمعیل پاشا کے فرمان ۱۲ جمادی الاُولی ۱۲۹۱ھ (۱۸۸۴ء) کی بناء پر مصر کو استقلال حاصل ہوا اور وہ آزاد ہو گیا۔" (۱۵)

مصر میں اسی عرصے میں ایک اصلاحی تحریک بھی جاری تھی جو 'مذہب السلف الصالح' کی تحریک کہلاتی ہے۔ اس تحریک نے بھی بعد ازاں مصر میں قانون سازی کے عمل پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں:

"مصر میں بھی جدید اصلاحی تحریک جاری تھی جو 'تحریک سلفیہ' یا 'مذہب السلف الصالح' کی تحریک کہلاتی ہے۔ یہ تحریک سید جمال الدین افغانی (۱۸۳۹ تا ۱۸۹۷ء) اور ان کے بعد ان کے شاگرد استاذ امام شیخ محمد عبدہ (۱۸۴۹ تا ۱۹۰۵ء) مفتی مصر نے جاری کی۔۔۔ مذہب سلفیہ کا نصب العین یہ ہے کہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کیا جائے اور جمود اور خرافات اور مخالف دین بدعتوں اور ہر اندھی تقلید کے خلاف جہاد کیا جائے۔۔۔ انہیں اصول کی بناء پر مذہب سلفیہ کے لوگ اسلام کے مختلف مذاہب کا اتحاد چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ کوئی اسلامی فرقہ ایک مذہب کے مقلدین کی تقلید کا بار برداشت نہیں کر سکتا اور نہ وہ اپنے امور خانگی اور مالی معاملات کی فلاح و بہبود کو ہر حالت میں صرف ایک مذہب کی کتابوں سے وابستہ کرنا پسند کرے گا۔ (۱۶)

مصر کے حکمران اسماعیل پاشا نے اسی تحریک سے متاثر ہو کر استاذ مونوری کو یہ کام سونپا کہ وہ فرانسیسی قانون کو مذہب امام مالک کے مطابق ڈھالیں۔ شیخ عبد الرحمن عبد العزیز القاسم لکھتے ہیں:

"۱۸۷۵ء میں مصری حکومت نے ایک فرانسیسی وکیل استاذ مونوری، جو مصر میں مقیم تھے، کو مختلط عدالتوں کے لیے فرانسیسی قانون سازی کے طرز پر قوانین وضع کرنے کا کام سونپا۔ پس استاذ مونوری نے فرانسیسی قانون کو مد نظر رکھتے ہوئے مصر کے مدنی قوانین (civil laws)، بری و بحری تجارت کے قوانین، دعوی دائر کرنے کے قوانین، جرائم کی سزا اور ان کی تحقیق کے قوانین وضع کیے۔" (۱۷)

یہ قانون 'مخلوط قانون مدنی' کے نام سے ۱۸۷۵ء میں جاری ہوا۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں:

"اس کے بعد ۱۸۷۵ء میں غیر ملکیوں کے مقدموں پر غور کرنے کے لیے مخلوط عدالتیں قائم ہوئیں اور ان کے لیے مخلوط قانون مدنی ۱۸۷۵ء میں جاری ہوا۔" (۱۸)

۱۸۸۳ء میں ایک اطالوی استاذ موروندو نے حکومت کے کہنے پر 'ملکی قانون مدنی' وضع کیا۔ شیخ عبد الرحمن عبد العزیز القاسم لکھتے ہیں:

"جیسا کہ ایک اطالوی استاذ موروندو نے (حکومت کی ایماء پر) ۱۸۸۳ء میں ملکی مدنی قانون وضع کیا۔" (۱۹)

تقنین کی ان کوششوں میں فقہ حنفی کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے عوام الناس میں شدید رد عمل سامنے آیا کیونکہ اس قانون سازی سے پہلے مصر میں سلطنت عثمانیہ کا مجلہ أحکام عدلیہ نافذ تھا۔ ایک طرف تو اسماعیل پاشا نے اس مجلے کو کالعدم قرار دیا جبکہ دوسری طرف نئی قانون سازی کے لیے بنیاد بھی فقہ حنفی کی بجائے فقہ مالکی کو بنایا گیا تھا۔ اس احتجاج کے نتیجے میں حکومت کی ایماء پر معروف مصری فقیہ جناب محمد قدری پاشا نے 'مرشد الحیران إلی معرفۃ أحوال الإنسان' لکھی جو

فقہ حنفی کے مذہب پر تھی۔ مفتی عبد القیوم جالندھری لکھتے ہیں:

"اسماعیل پاشا نے تحریک مذکور (یعنی تحریک سلفیہ) سے متاثر ہو کر دولت عثمانیہ کے مجلہ اَحکام عدلیہ کو جو فقہ حنفی کی ایک کتاب تھی ترک کر کے شیخ مناری کو یہ خدمت سپرد کی کہ وہ فرانسیسی قانون کو امام مالکa کے مذہب یا فقہ سے تطبیق دیں تا کہ علمائے کرام کی شکایت رفع ہو جائے۔ عالم موصوف نے موضوع مذکور پر بڑی ضخیم کتاب تصنیف کی اور مصر کا مدنی قانون نپولین کے فرانسیسی بدنی قانون سے نقل کیا اس پر بعض اصحاب نے احتجاج کیا۔ اس کی ضرورت نہ تھی۔"(۲۰)

محمد قدری پاشا نے مصری اسلامی قانون کی تدوین میں اہم خدمات سر انجام دی ہیں۔ ان کی تین کتابوں کو بطور قانون نافذ کیا گیا۔ شیخ عبد الرحمن عبد العزیز القاسم لکھتے ہیں:

"ان کی کتابوں میں سے۔۔۔ ایک کتاب 'مرشد الحیران اِلی معرفۃ اَحوال الاِنسان' ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں فقہ حنفی سے استفادہ کیا ہے۔ یہ کتاب ۱۰۴۵ دفعات پر مشتمل ہے کہ جس میں اَموال اور ان سے متعلقہ حقوق، ملکیت کے اسباب، شفعہ اور اس کے احکام، قرضوں کے احکام، امانت، ضمانت اور معاہدات کے احکامات عموماً اور عقد بیع، اجارۃ، مزارعت، مساقات، شراکت، ادھار، قرض، امانت، کفالت، حوالہ، رہن اور صلح کے بارے میں تفصیلاً احکامات ہیں۔ اس کتاب میں ہر مسئلے کے بیان میں انہوں نے حواشی میں اس کے اصل مصدر کا بھی تذکرہ کر دیا ہے کہ جس سے انہوں نے وہ مسئلہ لیا تھا تا کہ جب بھی کوئی ایسا معاملہ درپیش ہو تو ایک مدرس، محقق، استاذ یا جج کے لیے ان احکامات کی صحت، ان کا مصدر اور ان کی قوت استدلال کو ان کے اصلی مصادر سے معلوم کرنا آسان ہو۔ حکومت مصر نے ۱۸۹۰ء میں اس کتاب کو شائع کیا۔"(۲۱)

جناب قدری پاشا کی دوسری کتاب قانون وقف کے بارے میں تھی۔ شیخ عبد الرحمن عبد العزیز القاسم لکھتے ہیں:

"انہوں نے وقف اور اس کے احکام کے بارے میں ایک اور قانون بھی وضع کیا جس کا نام انہوں نے 'کتاب العدل والانصاف فی حل مشکلات الاَوقاف' رکھا۔ یہ قانون ۶۴۶ دفعات پر مشتمل تھا اور ۱۸۹۳ء میں طبع ہوا۔"(۲۲)

ان کی تیسری کتاب 'قانون الاَحوال الشخصیۃ' عائلی قوانین سے متعلق تھی۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں:

"اس کے علاوہ حکومت مصر نے حنفی مذہب کے مطابق شخصی حالات کے شرعی احکام (یعنی عائلی قوانین) کی تدوین کا کام محمد قدری پاشا مرحوم کے سپرد کیا، چنانچہ انہوں نے ۶۴۷ دفعات کی ایک

کتاب مرتب کی جس میں نکاح، طلاق، اولاد، نابالغ کی سرپرستی، حجر (روکنا)، ہبہ، وصیت اور میراث کے مسائل درج کیے اور وہ مصر اور دوسرے اسلامی ملکوں کی شرعی عدالتوں میں مستند قرار پائی۔"(۲۳)

۱۹۲۰ء تک مصر کی عدالتوں میں امام أبو حنیفہ کے راجح ترین قول کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ مفتی سید عبد القیوم جالندھری لکھتے ہیں:

"قانون ترتیب محاکم شرعیہ ۱۹۱۰ء کی دفعہ ۲۸۰ کے مطابق امام أبو حنیفہ کے راجح ترین اقوال پر عمل کیا جاتا تھا لیکن قانون ۲۵ (۱۹۲۰ء) میں قاضی کو اختیار دیا گیا کہ وہ نفقہ عدت مفقود وغیرہ معین مسائل میں امام مالک اور امام شافعی کے اقوال پر بھی عمل کرنے کا مجاز ہے۔"(۲۴)

دوسری طرف تحریک سلفیہ شیخ جمال الدین افغانی(متوفی ۱۸۹۷ء) اور شیخ مفتی محمد عبدہ (متوفی ۱۹۰۵ء) کی وفات سے رکی نہیں بلکہ اس تحریک کو شیخ رشید رضا(۱۸۶۵ تا ۱۹۳۵ء) اور جامعہ أزہر کے شیخ مصطفی المراغی (۱۸۸۱ تا ۱۹۴۵ء) کی صورت میں دو نئے امام مل گئے۔ ان حضرات نے مصری قانون میں تمام مذاہب اسلامیہ سے استفادہ کی فکر کو جاری رکھا جس کی وجہ سے اسی دوران حکومت مصر نے مذاہب أربعہ کے کبار علماء کی ایک کمیٹی بنادی۔ أستاذ محمد سلام مدکور لکھتے ہیں:

"حکومت مصر نے کبار فقہاء اور ماہرین قانون پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دینے کا پروگرام شروع کیا تا کہ وہ کسی معین مذہب کی تقلید کی بجائے تمام مذاہب اسلامیہ سے استفادہ کرتے ہوئے زمانے کے حالات وروح کے مطابق قوانین وضع کرے۔ پس حکومت نے مذاہب أربعہ کے کبار علماء پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی۔"(۲۵)

اس کمیٹی کی کوششوں سے کئی ایک قانونی مسودات تیار ہوئے۔ أستاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ ان مسودات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پس اس کمیٹی نے نکاح، طلاق اور ان سے متعلقات پر مبنی اپنا پراجیکٹ مکمل کر لیا جو ۱۹۱۶ء میں طبع ہوا اور ۱۹۱۷ء میں اس کو دوبار تنقیح کے بعد شائع کیا گیا۔"(۲۶)

لیکن بعض حنفی مقلد علماء، کہ جن کا عوام الناس میں خاصا اثر تھا، نے صرف حنفی مذہب پر مبنی قانون سازی ہی کو تقنین کا صحیح منہج قرار دیا اور قانون سازی کی ان اجتماعی کوششوں کا سختی سے رد کیا۔ پس حکومت اس کمیٹی کی سفارشات پر کوئی قانون سازی نہ کر سکی۔ أستاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"لیکن اس کے ساتھ ہی بعض علماء اور ان کے حلقہ فکر سے متعلق عوام الناس نے اس قانون کی

اشاعت پر شدید ردعمل کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے یہ پراجیکٹ(project)نافذ نہ ہوسکا اور نہ ہی اس کی بنیاد پر کوئی قانون جاری ہوا۔"(۲۷)

علماء کی ان اجتماعی کوششوں کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ فقہ حنفی کے بعض ایسے مسائل کہ جن کی بنیاد پر قانون سازی میں عوام الناس کی مصالح کو بہت زیادہ ضرر پہنچنے کا اندیشہ تھا، میں حکومت نے دوسرے فقہی مذاہب کی آراء کو اختیار کرتے ہوئے کچھ جزوی قانونی ترامیم جاری کیں۔ اُستاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"ہاں حکمرانوں نے اس کمیٹی کے وضع کرہ قانون کی روشنی میں بعض ان قانونی پیچیدگیوں کی اصلاح کرلی، جن میں فقہ حنفی کی، مصلحت عامہ سے عدم مطابقت بہت واضح تھی۔ پس ۱۹۰۲ء میں قانون نمبر ۲۵، ۱۹۲۳ء میں قانون نمبر ۵۶ جاری ہوا جس میں شادی کی کم سے کم عمر کو متعین کیا گیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۲۹ء میں بھی قانون نمبر ۲۵ جاری ہوا۔ ان تمام قوانین کی وجہ سے عائلی زندگی مثلاً نکاح، نفقہ، عدت، طلاق، نسب، مہر، حضانت اور مفقود الخبر وغیرہ سے متعلق بعض پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل حل ہوگئے۔ ۱۹۲۰ء میں صادر ہونے والا قانون اگرچہ مذاہب اربعہ سے لیا گیا تھا لیکن ۱۹۲۳ء اور ۱۹۲۹ء کے قانون میں تو مذاہب اربعہ کی قید بھی نہیں تھی (بلکہ وہ بعض تابعین رحمۃ اللہ علیہم اور دوسرے فقہی مذاہب کی آراء پر مبنی تھا)۔"(۲۸)

مصری فقہاء میں بالخصوص اور اب تو عالم اسلام میں بالعموم یہ فکر بہت تیزی سے پھیل رہی ہے کہ تمام مذاہب اسلامیہ کو ایک ہی مذہب شمار کرتے ہوئے ان سے قانون سازی اور جدید فتاوی میں استفادہ کیا جائے۔ یہ ایک بہت ہی عمدہ رائے اور امت مسلمہ کے اتحاد کے لیے اَز بس ضروری قدم ہے۔ معروف شامی فقیہ استاذ مصطفی الزرقاء حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"عصر حاضر کے بعض علماء کا خیال یہ ہے کہ تمام فقہی مذاہب کے مجموعے کو شریعت اسلامیہ میں ایک بہت بڑے فقہی مذہب کے طور پر لینا چاہیے۔ ان مذاہب میں سے ہر ایک مثلاً حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ کو اس ایک بڑے عمومی مذہب میں ایسا ہی سمجھنا چاہیے جیسا کہ ایک انفرادی مذہب میں ایک ہی مذہب کے علماء کے مختلف اقوال یا آراء ہوتی ہیں۔ پس علمائے امت کو اس بڑے اور عمومی مذہب کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور اس کی بنیاد پر قضاء اور فتوی کے میدانوں میں وہ قانون سازی کرے، جو موجودہ زمانے کے حالات اور ہر زمانے کے مصالح و مقتضیات کو حد درجے پورا کرنے والی ہو۔ میرے نزدیک یہ ایک پختہ رائے ہے۔" (۲۹)

اس فکر کے اثرات مصر کے قانون میں کافی نمایاں ہیں۔ بعض اوقات تو ایسے قوانین بھی وضع

کیے گئے جو مذاہب اربعہ کے مفتی بہ اقوال کے خلاف تھے۔ استاذ مصطفی زرقاء حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"پھر ۱۹۲۹ء میں حکومت مصر نے مختلف اجتہادات، مثلاً ان سے بھی کہ جو مذاہب اَربعہ میں شامل نہیں ہیں، سے استفادہ کرنے کے لیے ایک وسیع طریقہ کار طے کیا۔ پس حکومت مصر نے قانون ۲۵ صادر کیا، جس کے مطابق اکثر حالات میں معلق طلاق کو لغو قرار دیا۔ اسی طرح اس قانون میں ایک ہی لفظ کے ساتھ تینیا دو طلاقوں کو امام ابن تیمیہa کی رائے اور ان کی شرعی دلیل پر عمل کرتے ہوئے ایک ہی شمار کیا گیا۔ یہ قانون شیخ الازہر کی رضامندی سے طے ہوئے ہیں تاکہ طلاق ثلاث اور معلق طلاق کی تکالیف سے نجات حاصل کی جائے جس کا ارتکاب عموماً جاہل اور نادان مرد حضرات جھگڑے اور شدید غصے کی حالت میں کرتے ہیں۔ پس یہ لوگ سنت طلاق اور اس کے بنیادی مقاصد کی مشروع حدود کو پھلانگ جاتے ہیں اور بعد میں اس مصیبت سے نکلنے کے لیے مختلف قسم کے حیلے اور گھٹیا ذرائع تلاش کرتے ہیں، جیسا کہ اہل علم ان وسائل و ذرائع سے آگاہ ہیں۔"(۳۰)

اسی طرح ۱۹۳۱ء میں بھی بعض ایسے جزوی قوانین جاری ہوئے جو مذہب حنفی کے مطابق نہ تھے۔ استاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"۱۹۳۱ء میں شرعی عدالتوں کی تنظیم کے لیے قانون ۷۸ جاری ہوا۔ یہ قانون بھی بعض ایسی دفعات پر مشتمل تھا جو صرف ایک ہی فقہی مذہب سے نہیں لی گئی تھیں۔"(۳۱)

۱۹۳۶ء ہی میں حکومت کی طرف سے علماء کی ایسی کمیٹی بھی تشکیل دی گئی جو متنوع مذاہب اسلامیہ کی روشنی میں مصر کے مختلف قوانین کی ترتیب و تدوین کا منصوبہ سنبھالے۔ استاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"پھر حکومت مصر نے ایک فقہی مذہب کی پابندیوں سے نکلنے کے لیے ایک نیا قدم اٹھایا اور ۹ دسمبر ۱۹۳۶ء میں وفاقی کابینہ نے وزارت عدل و انصاف کی ایک سفارش کہ جس میں اس مسئلے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دینے کی تجویز دی گئی تھی، کی حمایت کی۔ اس تجویز میں یہ تھا کہ یہ کمیٹی ایک ایسے قانونی منصوبے کا آغاز کرے گی کہ جس کے ذریعے عائلی قوانین سے متعلقہ مسائل، اوقاف، وراثت اور وصیت وغیرہ کے بارے میں قانون سازی کی جائے گی۔ یہ قانون سازی صرف ایک فقہی مذہب کے دائرے میں رہ کر نہیں ہو گی بلکہ کمیٹی کو یہ اختیار ہو گا کہ وہ جمیع فقہاء کے فتاویٰ اور خصوصاً ان آراء سے استفادہ کرے جو لوگوں کی مصالح اور خارج میں موجود معاشرتی تبدیلیوں کے لیے مناسب و مفید ہوں۔ کمیٹی کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ جس مسئلے میں یہ محسوس

کرے کہ اس کے بارے میں شکایت عام ہے یا اس میں قانون سازی کی شدید ضرورت ہے تو وہ اس مسئلے کو قانون سازی کے لیے بنیاد بنا سکتی ہے۔"(۳۲)

اس کمیٹی نے جلد ہی اپنے کام کا آغاز کر دیا اور سب سے پہلے قانون وراثت کو مدون کیا کیونکہ اس میں اختلافات بہت کم ہیں۔ کمیٹی نے معاشرے میں پائے جانے والے بعض جدید مسائل و ابحاث کے تناظر میں کچھ ایسے قوانین بھی مرتب کیے جو معروف فقہی مذاہب کے مطابق نہ تھے۔ استاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"اس کمیٹی نے اپنے کام کا آغاز قانون وراثت سے کیا کیونکہ اس میں تبدیلی نسبتاً کم تھی۔ پس ۱۹۴۳ء میں جمیع احکام وراثت پر مشتمل قانون ۷۷ جاری ہوا۔۔۔اس قانون کے ان اہم ضوابط میں سے کہ جو معمول بہ فتاوی کے خلاف ہیں، ایکیہ ہے کہ بھائیوں اور بہنوں کو 'جد صحیح' کی موجودگی میں اس وقت بھی وارث شمار کیا گیا ہے جبکہ دادا ان کو محروم کر رہا ہو۔ اسی طرح میاں یا بیوی میں سے ایک اگر فوت ہو جائے تو بحثیت ذوی الفروض اپنا حصہ لینے کے بعد بھی ان میں کوئی ایک ذوی الفروض رشتہ داروں کو ورثہ کی ادائیگی کے بعد بقیہ مال لے سکتا ہے بشر طیکہ متوفی کا کوئی قریبی رشتہ دار (عصبہ نسبی) موجود نہ ہو کیونکہ میاں، بیوی کا تعلق عصبہ سببی (مالک اور اس کے آزاد کردہ غلام کے تعلق) کی نسبت زیادہ قربت کا ہوتا ہے۔" (۳۳)

اسی طرح کی قانون سازی اس کمیٹی نے قانون وقف کے بارے میں بھی کی اور اسے تقریباً قانون وراثت کے قریب پہنچا دیا۔ استاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"پھر ۱۹۴۶ء میں قانون ۴۸ صادر ہوا، جس کے ذریعے وقف کے بعض احکام کو تبدیل کیا گیا۔ اس قانون کے اکثر ضوابط کو تمام مذاہب کے مختلف فقہاء کی آراء سے اخذ کیا گیا تھا اور اس کے ذریعے ایسے قوانین کی خواہش کی گئی ہے جن سے لوگوں کی مصالح پوری ہوں اور جو ملک کے اقتصادی نظام میں رکاوٹ پیدا نہ کریں۔ اس قانون کے اہم ضوابط میں سے ایکیہ ہے کہ قانون وقف کو قانون میراث کے قریب کر دیا گیا ہے اور ملکی وقف کے جمیع قوانین کو ۱۹۵۲ء میں قانون ۱۸۰ کے ذریعے ختم کر دیا گیا ہے۔"(۳۴)

اسی کمیٹی کی کوششوں سے ۱۹۴۶ء میں قانون وصیت بھی جاری ہوا۔ اس قانون کے ذریعے بھی معاشرے کے بعض پیچیدہ اور الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ استاذ محمد سلام مدکور حفظہ اللہ کہتے ہیں:

"اسی طرح ۱۹۴۶ء میں قانون ۷۱ بھی جاری ہوا جو وصیت سے متعلقہ مسائل کے بارے میں

تھا۔ یہ قانون بھی کسی ایک فقہی مذہب یا صرف مذاہب اَربعہ کی آراء پر مشتمل نہ تھا۔ اس قانون کی اہم دفعات میں سے ایک جبری وصیت کی شق ہے۔ اس شق کے مطابق جو پوتے اپنے دادا اور دادیوں کی وراثت سے محروم ہو جاتے ہوں، ان کے لیے ورثہ میں (بطور جبری وصیت) لازمی حصہ شامل ہو گا اور یہ حصہ وہ گا جو ان کے والد کے زندہ ہونے کی صورت میں ان کو ملنا تھا بشرطیکہ وہ حصہ (جو پوتے کو ملنا ہے) کل ترکہ کے ایک تہائی سے زائد نہ ہو اور یہ بھی کہ ان کے دادا یا دادی نے ان کے حق میں کوئی اور وصیت نہ کی ہو۔ یہ قانون بعض تابعین اور فقہ اباضیہ کی رائے کے مطابق بنایا گیا ہے۔ اسی طرح اس قانون کے مطابق وارث کے لیے بھی وصیت کا ایک تہائی ترکہ کی حدود میں جائز قرار دیا گیا ہے، چاہے باقی ورثا راضی ہوں یا نہ ہوں۔"(۳۵)

۱۹۳۶ء میں ہی علماء کی ایک کمیٹی نے مختلف مذاہب کی روشنی میں مصر کے جدید مدنی قانون Civil Law) (کو مرتب کیا۔ ڈاکٹر صبحی محمصانی لکھتے ہیں:

"مصر کے مدنی (سِوَل) قانون کی تنقیح کے لیے پہلی کمیٹی ۱۹۳۶ء میں، دوسری کمیٹی ۱۹۳۸ء میں اور تیسری کمیٹی ۱۹۳۸ء کے آخر میں زیر قیادت ڈاکٹر عبد الرزاق سنہوری بیگ بنائی گئی۔ آخری کمیٹی نے تقریباً دو سال کے عرصے میں اپنا کام مکمل کر لیا اور اس کے بعد توضیحی اور ٹھوس یاداشتیں قلم بند کیں۔ جدید مسودہ قانون میں ۱۱۴۹ دفعات ہیں اور وہ تین ماخذوں سے لیا گیا ہے: قانون مقارن، اجتہاد القضاء المصری اور شریعت اسلامیہ۔"(۳۶)

یہ قانون ۱۹۴۹ء میں نافذ ہوا۔ مفتی عبد القیوم جالندھری لکھتے ہیں:

"قانون مذکور ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء سے نافذ ہوا اس نے قانون مدنی ۲۸ اکتوبر ۱۸۸۲ء اور قانون مدنی محکمہ جات مختلط ۲۸ جون ۱۸۷۵ء کو منسوخ کر دیا۔"(۳۷)

یہ مصر میں اسلامی بنیادوں پر قانون سازی کی ایک مختصر سی تاریخ تھی۔ اب ہم عالم عرب اور عالم اسلام کے مرکز سعودی عرب میں تقنین کے حوالے سے ہونے والے کوششوں کا ایک مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں۔

سعودی عرب میں قانون سازی کی تاریخ

سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں سعودی عرب کا اکثر علاقہ خلافت عثمانیہ کے تحت تھا اور یہاں تقریباً وہی قانون لاگو تھا جس کا نفاذ ترکی میں تھا۔ ترک حکمرانوں کی بعض پالیسوں سے اختلاف کرتے ہوئے اس وقت کے ایک مقامی عرب حکمران عبد العزیز بن سعود نے فوج جمع کر کے ترکوں کے خلاف

جنگ شروع کر دی اور ۱۹۰۲ء میں نجد کے دار الحکومت ریاض کو فتح کر لیا۔جنگ عظیم اول (۱۹۱۴ء)کے دوران سلطان عبد العزیز بن سعود، عرب کے مرکزی علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔اس جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ نے جرمنی کی، جبکہ ابن سعود نے برطانیہ کی حمایت کی۔برطانیہ کی تحریک پر ابن سعود نے ترکوں کے خلاف جنگ جاری رکھی جس کے نتیجے میں دولت عثمانیہ نے حجاز کا علاقہ بھی خود ہی خالی کر دیا۔۱۹۲۴ء میں والی مکہ سلطان حسین نے خلیفۃ المسلمین ہونے کا دعوی کیا لیکن ابن سعود نے اس کو باغی قرار دیتے ہوئے اس کے خلاف لشکر کشی کی اور حجاز فتح کر لیا۔۱۹۲۶ء میں ایک صلح کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ابن سعود کو سعودی عرب جبکہ والی مکہ سلطان حسین کے بھائیوں کو عراق اور شرق اردن کا بادشاہ تسلیم کیا گیا۔

جدید سعودی عرب کے قیام میں آل سعود کے ساتھ محمد بن عبد الوہاب اور ان کے خاندان یعنی آل الشیخ کا بھی کافی نمایاں حصہ تھا لہذا اس سلطنت کے قیام کے وقت ہی سے مذہبی امور میں آل الشیخ کو خصوصی اہمیت حاصل رہی ہے۔اس سلطنت کے قیام ہی کے دور سے سعودی علماء فقہی قانون سازی کے تصور سے ناآشنا تھے۔پس سعودی عرب میں شروع ہی سے اسلامی قانون تحریری صورت میں نافذ نہیں رہا بلکہ قاضیوں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ پیش آنے والے مقدمات میں براہ راست قرآن و سنت کی روشنی میں فیصلے کریں۔ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"ان اسباب کی بنا پر سعودی عرب کے علماء کرام نے تدوین کو ناپسندیدہ قرار دیا اور جب ۱۹۲۴ء۔۱۹۲۵ء میں مملکت سعودی عرب کا قیام عمل میں آیا تو ان کے اس مشورہ یا رائے کے نتیجہ میں یہ طے کیا گیا کہ اسلامی احکام و قوانین کو غیر مرتب ہی رہنے دیا جائے اور جس طرح سے انگلستان میں کامن لاء نافذ ہوتا ہے، کم و بیش اسی طرح سے اسلامی شریعت کو بدستور نافذ العمل رکھا جائے۔چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک سعودی علماء کی یہی رائے رہی ہے اور اسی پر وہ عمل درآمد کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔آج بھی مملکت سعودی عرب میں وہ تمام قوانین غیر مدون ہیں جو وہاں کی عام عدالتوں کے دائرہ اختیار میں ہیں، مثلاً تمام عائلی قوانین، حدود و تعزیرات کے تمام احکام اور ایسے ہی دوسرے متعدد قوانین پر ضابطہ بندی کے بغیر ہی عمل درآمد ہوتا ہے۔"(۳۸)

مفتی عبد القیوم جالندھری لکھتے ہیں:

"سعودی عرب میں مکمل دستور نافذ نہیں۔دوسرے اسلامی ممالک کی طرح کوئی مدنیا تعزیری

قانون نہیں۔ چیف جج سے محکمہ شرعی متعلق ہے وہ اس میں قرآن وسنت کے مطابق احکام صادر کرتا ہے۔ چور کے لیے قطع ید کی سزا مقرر ہے۔ زنا کی سزا سنگ ساری ہے۔"(۳۹)

سعودی عرب کے اکثر علماء اور کبار فقہاء نے بعض اسباب کی وجہ سے، کہ جن کا تذکرہ ہم نے تقنین کے عیوب کے عنوان سے کیا ہے، مجتہد فیہ شرعی احکام میں قانون سازی کو حرام قرار دیا ہے۔ وہ جلیل القدر سعودی علماء کہ جنہوں نے تقنین کو حرام ٹھہرایا ہے، میں شیخ محمد امین شنقیطی، عبد اللہ بن حمید، عبد العزیز بن باز، عبد الرزاق عفیفی، ابراہیم بن محمد آل الشیخ، عبد العزیز بن صالح، محمد الحرکان، سلیمان العبید رحمۃ اللہ علیہم، عبد اللہ بن عبد الرحمن الغدیان، صالح بن محمد اللحیدان، عبد اللہ بن عبد الرحمن الجبرین، صالح بن فوان الفوازان، بکر بن عبد اللہ ابو زید، عبد الرحمن بن عبد اللہ العجلان، عبد اللہ بن محمد الغنیمان اور عبد العزیز بن عبد اللہ راجحی حفظہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔

جب تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نئے مسائل اور ان کے بارے میں قانون سازی کی ضرورت کا احساس بیدار ہوا تو اس کا حل سعودیہ میں یہ نکالا گیا کہ ایسے مسائل میں قانون سازی کو تدبیر وتنظیم کے دائرے میں شامل کرتے ہوئے شریعت اور شرعی احکام کی بحث سے خارج کر دیا جائے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"ان حالات میں برادر ملک سعودی عرب میں ایک نیا تجربہ کیا گیا۔ وہ تجربہ اپنی نوعیت کا منفرد تجربہ تھا اور آج تک خاصی حد تک کامیابی سے جاری ہے۔ وہ تجربہ یہ ہے کہ ان نئے معاملات کو جن کا تعلق بین الاقوامی تجارت کے معاملات سے ہو، عام عدالتوں کے دائرہ کار سے نکال دیا جائے اور ان کے لیے از سر نو نئے قوانین مرتب کر کے نافذ کیے جائیں۔ یہ کہنا شائد غلط نہ ہو گا یوں فقہ اسلامی کی بالا دستی سے ان مسائل کو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ ان نئے مسائل کے لیے نئے ضابطے تجویز ہوئے جن کا نام 'نظام' رکھا گیا۔" (۴۰)

یہ نظام کن قوانین پر مشتمل تھا؟۔ اس کے بارے میں ڈاکٹر محمود غازی لکھتے ہیں:

"یہ نظام بعینہ وہ قوانین ہیں جو دوسرے ممالک مثلاً مصر، شام، عراق یا کویت میں نافذ العمل ہیں۔ ان میں ترتیب ومندرجات کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ اسی طرح کے قوانین ہیں جیسے دنیا کے مختلف ممالک میں جاری ہے۔ دوسرے ملکوں میں ان کو قوانین اور سعودی عرب میں نظام کہتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ 'نظام' کا یہ دائرہ بین الاقوامی تجارت کی حدود سے نکلتا چلا گیا اور نئے نئے موضوعات 'نظام' کے دائرے میں شامل ہوتے گئے۔۔۔ بقیہ سارے

معاملات جن میں سعودی عرب کے انتظامی قوانین، وہاں کے اداروں کا داخلی نظم وضبط، حتی کہ باہر سے آنے والے کارکنوں اور مزدوروں کے حقوق، مقامی باشندوں اور باہر سے آنے والوں کے درمیان ذمہ داریوں کی تقسیم، ویزا کے قوانین، شہریت کے قوانین، یہ سب چیزیں وہ ہیں جو نظام کے تحت طے ہو رہی ہیں۔ نظام کی ترتیب کی تیاری میں نہ علماء کرام کا حصہ ہے اور نہ ہی کوئی ایسا پلیٹ فارم موجود ہے کہ فقہ حنبلیا شریعت اسلامیہ کے احکام کی روشنی میں اس 'نظام' کے مناسب یا غیر مناسب ہونے کا جائزہ لیا جائے۔"(۴۱)

'نظام' سے متعلقہ مسائل میں پیش آنے والے مقدمات کا فیصلہ شرعی عدالتوں میں نہیں ہوتا بلکہ ان مسائل و مقدمات کے حل کے لیے علیحدہ سے کچھ ادارے 'مجالس' کے نام سے قائم کیے گئے ہیں۔ اگرچہ کسی 'مجلس' کے تحت پیش آنے والے مقدمے کے فریقین کو یہ اختیار بھی حاصل ہوتا ہے کہ وہ شرعی عدالتوں میں اپنا مقدمہ لے جاسکتے ہیں۔ بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ 'مجلس' نے کسی مسئلے میں ایک فیصلہ دیا جبکہ شرعی عدالت نے اس مقدمے میں اس کے بالکل برعکس فیصلہ سنایا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"نظام کو شروع ہی سے عدالتوں اور علماء کے دائرہ کار سے باہر رکھا گیا۔ شروع ہی میں یہ طے ہو گیا تھا کہ 'نظام' پر عمل درآمد کے لیے عدالتوں کی بجائے نئے ادارے قائم کیے جائیں گے جن کو 'مجلس' کا نام دیا گیا۔ یہ 'مجلس' بظاہر ایک کمیٹی ہے لیکن اس کو عملاً وہ تمام عدالتی اختیارات حاصل ہیں جو دنیا کے کسی بھی ملک میں کسی بھی ایسی عدالت کو حاصل ہوتے ہیں جو تجارتی اور دوسرے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتی ہے۔ ابتداء میں ان مجلسوں کے روبرو وکلاء پیش نہیں ہوتے تھے۔۔۔ بعد میں آہستہ آہستہ 'مجالس' کے روبرو وکلاء کو پیش ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ اب سعودی عرب میں دو متوازی نظام چل رہے ہیں۔"(۴۲)

انہی جدید مسائل کے حل کے تناظر میں شرعی بنیادوں پر قانون سازی کی دعوتی تحریک وقتاً فوقتاً اٹھتی رہی ہے لیکن تاحال سعودی علماء اسے حرام ہی قرار دیتے آرہے ہیں اور ان کے نزدیک اس کے مفاسد اس کے فوائد سے بڑھ کر ہیں۔ شیخ عبد الرحمن بن سعد الشثری حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"بلاد سعودیہ میں قانون سازی کے لیے ملک عبد العزیز بن عبد الرحمن کے زمانے میں بعض علماء نے آواز اٹھائی۔ پس اس وقت کے تمام سعودی علماء نے اس کی بالاتفاق تردید کی۔ اس کے بعد ۱۴۲۶ھ میں اہل علم کی ایک مختصر جماعت نے اپنی بعض کتابوں اور رسائل میں اس دعوت کو دوبارہ عام کیا ہے۔ اللہ ہمیں اور اس قلیل جماعت کو اس مسئلے میں اپنے حکم سے ہدایت دے کہ

جس میں اختلاف ہوا ہے کیونکہ وہی وہ ذات ہے جو جس کو چاہتی ہے سیدھے رستے کی ہدایت دیتی ہے۔"(۴۳)

اسلامی قانون سازی میں سعودی عرب کا تجربہ باقی اسلامی ممالک کی نسبت بالکل ہی ایک منفرد تجربہ ہے اور بعض شعبوں میں مثلاً فوجداری قوانین (شرعی حدود و تعزیرات کے نفاذ) میں سعودی عرب کی شرعی عدالتوں کے فیصلے پوری دنیا کے لیے قابل اتباع اور ایک ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب ہم پاکستان مین قانون سازی کی تاریخ کا جائزہ قدرے تفصیل سے لیتے ہیں۔

پاکستان میں قانون سازی کی تاریخ

اگست ۱۹۴۷ء میں انگریزوں نے 'قانون آزادی ہند ایکٹ' کے تحت ہندوستان کو دو حصوں انڈیا اور پاکستان میں تقسیم کر دیا۔ اس ایکٹ میں یہ درج تھا کہ انڈیا اور پاکستان کی قانون ساز اسمبلیاں جب تک اپنے ممالک کے لیے کوئی آئین وضع نہیں کر لیتی وہ 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء' کے تحت نظم و نسق چلاتی رہیں گی۔ پاکستان کا پہلا دستور ۱۹۵۶ء میں نافذ ہوا اور اس دوران تقریباً آٹھ یا نو سال مملکت پاکستان میں انگریزوں کے چھوڑے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلے ہوتے رہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"عدالتی امور بھی انگریزوں کے چھوڑے ہوئے قوانین کے تحت چلائے جاتے رہے مثلاً تعزیرات پاکستان ۱۸۶۰ء' ضابطہ فوجداری ۱۸۹۸ء' ضابطہ دیوانی ۱۹۰۸ء اور پولیس ایکٹ ۱۸۱۸ء وغیرہ۔ تمام قوانین جو انگریزی استعمار کے دور میں نافذ کیے گئے تھے' جوں کے توں جاری رہے اور سالہا سال تک ان میں کسی تبدیلی کا ذکر تو کیا' ان میں ضروری رد و بدل پر بھی کسی نے سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ آزاد ملک کے آزاد شہریوں کے لیے پولیس ایکٹ بھی من و عن وہی نافذ کر دیا گیا اور آج تک نافذ ہے' جو انگریز حکمرانوں نے اپنے غلاموں کو کنٹرول کرنے کے لیے بنایا تھا۔"(۴۴)

اس دوران اگرچہ حکمران طبقہ تو کسی اسلامی قانون کے نفاذ میں عدم دلچسپی کا اظہار کرتا ہی رہا لیکن ملک کے نامور علماء اور دینی جماعتوں کے قائدین نے اس سلسلے میں خصوصی تحریک چلائی اور اس وقت کے چند جید اصحاب علم مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی' سید سلیمان ندوی' مولانا شبیر احمد عثمانی' مولانا ظفر احمد عثمانی' مولانا عبد الحامد بدیوانی' مولانا ظفر احمد انصاری' ڈاکٹر محمد حمید اللہ' ڈاکٹر اشتیاق حسین

قریشی اور سردار عبد الرب نشتر رحمۃ اللہ علیہ کی کوششوں سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے مارچ ۱۹۴۹ء میں ایک قرار داد منظور کی جو قرارداد مقاصد کے نام سے معروف ہوئی۔ڈاکٹر جسٹس (ر) تنزیل الرحمن لکھتے ہیں:

"۱۹۴۹ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرار داد مقاصد منظور کی جس کی رو سے پاکستان پر اللہ کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم کرتے ہوئے اس مقصد کی تکمیل کا ذمہ لیا گیا کہ مسلمانوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کو ان اسلامی تعلیمات اور مقتضیات کے مطابق ڈھال سکیں جو قرآن پاک اور سنت رسول میں متعین ہیں۔"(۴۵)

ڈاکٹر محمود احمد غازی اس قرارداد کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ قرار داد آج تک ایک متفق علیہ قانونی اور دستوری دستاویز کے طور پر پاکستان کے ہر دستور میں شامل رہی ہے۔۔۔افسوس ہے اس طرح کی کوئی جامع اور متفق علیہ دستاویز مسلم دنیا کے کسی اور ملک کے دستور میں شامل نہیں ہے۔۔۔اس قرار داد میں مسلمانوں کی تاریخ میں پہلی بار' بلکہ دنیا کی تاریخ میں بھی پہلی بار' اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ دور جدید کے تمام جمہوری تصورات کو اسلام کے دستوری احکام سے اس طرح ہم آہنگ کر دیا جائے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اسلامی تعلیم کے فلاں پہلو کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور جمہوری تصورات کا بڑے سے بڑا علمبردار بھی یہ نہ کہہ سکے کہ اس میں جمہوریت کے اصولوں کو پیش نظر نہیں رکھا گیا۔یہ قرارداد اسلامی دستوری اصولوں اور جدید نمائندہ حکومت کی ضرورتوں کے درمیان ایک مثالی' متوازن اور ہم آہنگ سلسلہ استدلال پیش کرتی ہے۔"(۴۶)

۱۹۴۹ء میں ہی پاکستان کی مرکزی اسمبلی نے ایک قانون پاس کیا' جس میں یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے مسائل شریعت کے مطابق حل کیے جائیں گے بشرطیکہ دونوں فریق مسلمان ہوں اور شریعت اسلامیہ کے مطابق اپنا فیصلہ چاہتے ہوں۔یہ ایک دوسطری قانون ۱۹۴۹ء میں ہی پاکستان کی مرکزی اسمبلی نے ایک قانون پاس کیا' جس میں یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کے نکاح و طلاق کے مسائل شریعت کے مطابق حل کیے جائیں گے بشرطیکہ دونوں فریق مسلمان ہوں اور شریعت اسلامیہ کے مطابق اپنا فیصلہ چاہتے ہوں۔یہ ایک دوسطری قانون تھا جو کئی سالوں تک مشرقی و مغربی پاکستان پر نافذ رہا۔

۱۹۵۰ء ہی کے لگ بھگ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں آئین سازی کے لیے سرکاری سطح پر ایک

بورڈ قائم کیا گیا' جس کا نام 'بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ ' رکھا گیا۔اس بورڈ میں اگرچہ اس وقت کے نامور دانشور اور علماء مثلاً سید سلیمان ندوی' ڈاکٹر محمد حمید اللہ' مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا ظفر احمد انصاری اور مفتی جعفر حسین رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ شامل تھے لیکن حکومت نے اس بورڈ کی پیش کی گئی سفارشات کو قانون سازی میں کوئی اہمیت نہ دی۔

جب بھی علماء یا دینی حلقوں کی طرف سے حکمران طبقے سے اسلامی قانون کے نفاذ کا مطالبہ کیا جاتا تو عام طور پر ان کا جواب یہ ہوتا تھا کہ کون سا اسلام نافذ کیا جائے؟ حنفی، بریلوی، شافعی، اہل تشیع یا اہل الحدیث کا؟ چنانچہ جنوری ۱۹۵۱ء میں ملک کے نامور شیعہ، بریلوی، دیوبندی اور اہلحدیث علماء کی ایک جماعت نے بائیس نکات پر مشتمل ایک متفقہ فارمولا منظور کیا۔ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"ان حضرات نے بائیس نکات پر مشتمل ایک ایسا مسودہ تیار کیا جس کے بارے میں ان حضرات نے اپنے انتہائی علم و بصیرت کے مطابق یہ قرار دیا کہ اگر بائیس نکات کسی دستور میں سمو دیے جائیں تو وہ دستور اسلامی دستور کہلائے گا، اس دستور کی بنیاد پر جو اسلامی ریاست قائم ہوگی وہ اسلامی ریاست کہلائے گی اور وہ ریاست جو قوانین نافذ کرے گی وہ اسلامی قوانین ہوں گے۔"(۴۷)

اس فارمولے پر دستخط کرنے والوں میں مولانا مودودی، سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد انصاری، مولانا ادریس کاندھلوی، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا عبد الحامد بدیوانی، پیر مانکی شریف اور مفتی جعفر حسین رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ جیسی نامور شخصیات شامل تھیں۔

علماء اس بائیس نکاتی فارمولے کو بنیاد بناتے ہوئے نفاذ اسلام کی کوششیں کرتے رہے یہاں تک کہ ۱۹۵۴ء میں جو دستور تیار ہوا اس کے آرٹیکل چار میں یہ طے پایا کہ اگر کوئی بھی شہری ملک کے کسی بھی قانون کے بارے میں سپریم کورٹ میں یہ دعوی دائر کرے کہ وہ اسلام کے خلاف ہے تو سپریم کورٹ کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ ایسے قانون کو اگر شریعت سے متعارض سمجھے تو اسے کالعدم قرار دے۔اسلامی شریعت کے نفاذ میں یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا دستور نافذ ہوا جس میں قرار داد مقاصد کو اس دستور کے مقدمے اور بائیس نکاتی فارمولے کی بعض باتوں کو ریاستی پالیسی کے رہنما اصولوں کے طور پر شامل کر لیا گیا۔ڈاکٹر تنزیل الرحمن لکھتے ہیں:

"۲۳مارچ ۱۹۵۶ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا دستور نافذ ہوا۔ اس دستور کے ذریعہ مسلمانوں کی زندگیوں کو قرآن مجید اور سنت رسول کے مطابق بنانے کا موقع فراہم کیا گیا۔ چناچہ دستور کی دفعہ ۱۹۸ کی روسے یہ قرار دیا گیا کہ اس ملک میں ایسا کوئی قانون نہیں بنایا جاسکے گا جو قرآن پاک اور سنت نبوی میں مذکور اسلامی احکام و تعلیمات کے منافی ہو۔ ساتھ ہی اس امر کا بھی اظہار کیا گیا کہ موجودہ قوانین کو قرآن پاک و سنت کے مطابق بنایا جائے گا۔۔۔ دستور پاکستان ۱۹۵۶ء کی دفعہ ۱۹۷ کے تحت صدر مملکت کو اس امر کا اختیار دیا گیا کہ وہ ایک اسلامی تحقیقاتی ادارے کی تشکیل کرے گا جو مسلم معاشرے کو صحیح اسلامی بنیادوں پر قائم کرنے میں ممد و معاون ہو۔"(۴۸)

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں پاکستان میں مارشل لاء لگنے کی وجہ سے ۱۹۵۶ء کا ئین کالعدم قرار پایا۔ جبکہ ۱۹۶۱ء میں مارشل لاء حکومت نے مغربی پاکستان میں ' نفاذ شریعت آرڈیننس' جاری کیا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں: "۱۹۶۱ء میں اس وقت کی حکومت مغربی پاکستان (اب پاکستان) نے ' نفاذ شریعت آرڈیننس' جاری کیا جن کے مطابق مسلم عائلی قوانین سے متعلق تمام معاملات مثلا شادی، طلاق، حضانت، وراثت، ہبہ اور وقف کے بارے یں یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ سب معاملات شریعت کے مطابق طے ہوں گے۔ ان موضوعات سے متعلق اسلامی احکام کو تحریری طور پر مدون کیے بغیر براہ راست شرعی قوانین نافذ کر دیے گئے۔"(۴۹)

۱۹۶۲ء ہی میں اس وقت کے گورنر مغربی پاکستان نے ایک قانون نافذ کیا، جس کے مطابق اگر کوئی ایک فریق بھی نکاح، طلاق، وراثت اور وصیت وغیرہ جیسے خانگی و معاشرتی معاملات میں شریعت کے مطابق فیصلہ چاہے گا، تو فریقین کے مابین رائج الوقت قانون کی بجائے شریعت کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ اس میں ایک استثناء پھر بھی باقی رہا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لیکن اس میں ایک استثناء موجود رہا، جس کا ماحصل یہ تھا کہ والیان ریاست یا وہ لوگ جن کو اس قانون کی روسے خاص استحقاق حاصل تھا، ان کے لیے وراثت کا قانون انگریزوں کے اصول ہی پر جاری رہے گا۔ وہ یہ تھا کہ نواب یا جاگیر دار کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا وارث ہو گا اور سب سے بڑے بیٹے کی وفات کے بعد اس کا سب سے بڑا بیٹا وارث ہو گا۔ اس میں چھوٹے بیٹوں، بیٹیوں، بہنوں سب کو ہر قسم کی جائیداد کے حق وراثت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ یہ قانون برصغیر میں کم وبیش سو سال جاری رہا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ خواتین کے حقوق کی علمبردار کسی تنظیم

نے کبھی اس کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی۔"(۵۰)

گورنر پاکستان ملک محمد امیر خان نے اسی دوران ایک ایسے آرڈیننس کا بھی اجراء کیا جس میں طوائفوں کے پیشے کو ممنوع اور قابل سزا جرم قرار دیا گیا۔ نتائج سے قطع نظر فی نفسہ یہ ایک خوش آئند اقدام تھا۔

۱۹۶۲ء ہی میں فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں مسلمانوں کے عائلی قوانین کے حوالے سے 'مسلم عائلی قوانین آرڈیننس' کے نام سے ایک قانون نافذ کیا گیا۔ اس آرڈیننس میں یتیم پوتے کی وراثت، طلاق اور دوسری شادی کے حوالے سے بعض ایسے قوانین تھے جو اسلامی تعلیمات کے منافی تھے۔ مثال کے طور پر اس قانون میں یہ بات طے کی گئی کہ پہلی بیوی کی رضامندی کے بغیر شوہر کو دوسری شادی کی اجازت نہ ہوگی اور اگر کسی نے ایسی شادی کی تو وہ قانوناً ناجائز تصور ہوگی۔ جدت پسندوں نے اس آرڈیننس کی تائید کی جبکہ علماء کے حلقوں کی طرف سے اس پر شدید تنقید ہوئی۔

۱۹۶۲ء میں اس وقت کی مارشل لاء حکومت نے ایک دستور نافذ کیا، جس میں بعد ازاں شدید عوامی دباؤ کے نتیجے میں مملکت پاکستان کے نام کے ساتھ 'اسلامی جمہوریہ' کا لفظ بھی لگایا گیا۔ اس دستور کے مطابق بھی اس اصول کو تسلیم کیا گیا کہ پاکستان میں کوئی بھی قانون سازی قرآن و سنت کے منافی نہ ہوگی۔ ڈاکٹر تنزیل الرحمن لکھتے ہیں: "دستور کی دفعہ ۱۹۹ کے تحت صدر مملکت کو اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کے قیام کا اختیار دیا گیا تاکہ یہ کونسل پاکستان کے مسلمانوں کو ہر شعبہ زندگی میں اسلام کے اصولوں اور تصورات کے مطابق عمل کرنے کی ترغیب اور امداد دے سکے۔ نیز یہ بھی جائزہ لے سکے کہ آیا کوئی مجوزہ قانون اسلام کے خلاف یا منافی ہے؟۔"(۵۱)

اسی دستور کی دفعہ ۲۰۷ کے تحت صدر کو 'ادارہ تحقیقات اسلامی' کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کا بھی اختیار دیا گیا جو اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں اپنی تحقیقات پیش کرے۔ اسی ادارے کے تحت کئی ایک علمی منصوبے پایہ تکمیل کو پہنچے جن میں ڈاکٹر تنزیل الرحمن کا 'مجموعہ قوانین اسلام' ایک نمایاں و گراں قدر کوشش ہے۔ اس ادارے میں بعد میں کچھ غیر سنجیدہ افراد بھی شامل ہو گئے جس کی وجہ سے اس ادارے کی بہت بدنامی ہوئی۔ ڈاکٹر محمد امین حفظہ اللہ لکھتے ہیں:

"حکومت نے خود ہی ادارے کو شایان شان اہمیت نہ دی، اس کا اپنا کیمپس نہیں، نہ ہی اس کو یونیورسٹی کا درجہ دیا گیا، یہ مختلف ادوار میں مختلف وزارتوں سے منسلک رہا اور اس چیز نے اس کی

کارکردگی کو بہت بری طرح متاثر کیا۔۔ڈاکٹر فضل الرحمن اور ان کے ساتھیوں کی تجدد پسندی نے بھی اس ادارے کے وقار اور سنجیدگی کو نقصان پہنچایا ہے۔ حکومتی ذرائع سے بھی اس کی کارکردگی کو کبھی نمایاں نہیں کیا گیا۔"(۵۲)

۱۹۷۳ء میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ایک نیا آئین تیار ہوا جو اگست ۱۹۷۳ء میں نافذ ہوا۔ 'اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل' کو 'اسلامی نظریاتی کونسل' کا نام دیا گیا۔ اس کونسل نے ۱۹۷۳ء میں کام شروع کیا اور تقریباً تین سالوں کے دوران بہت سی مفید سفارشات پیش کیں جن میں سے چند ایک کو چھوڑ کر اکثر سرد خانے کی نذر ہو گئیں۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

"یہ تمام سفارشات و تجاویز متعلقہ سرکاری فائلوں میں دفن ہو گئیں۔ البتہ کونسل نے جو سفارشات امتناع شراب، گھوڑ دوڑ پر جوئے کے خاتمے، نائٹ کلبوں کی بندش اور جمعۃ المبارک کی تعطیل کے بارے میں دیں، حکومت نے اپریل ۱۹۷۷ء کے ہنگامہ خیز ایام میں ان کو منظور کر کے پاکستان میں شراب، گھوڑ دوڑ پر جوا اور نائٹ کلبوں پر پابندی لگا دی اور جمعہ کے دن ہفتہ وار عام تعطیل کا اعلان کر دیا۔"(۵۳)

جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں اس کونسل میں جلیل القدر علماء شامل تھے لیکن بعد کے ادوار میں عموماً ایسے افراد کو کونسل کی رکنیت مہیا کی گئی جن کی دینی حیثیت علماء، دینی حلقوں اور عامۃ الناس کے ہاں معتبر نہ تھی۔ خاص طور پر جنرل پرویز مشرف (۱۹۹۹ء تا ۲۰۰۸ء) کی تشکیل کردہ نظریاتی کونسل اکثر و بیشتر ایسے ارکان پر مشتمل تھی جن کی دینی حیثیت یا علمی اہلیت مملکت کے جمہور عوام کے ہاں مشتبہ و مشکوک تھی۔ یہی وجہ ہے کہ کونسل اپنی نت نئی سفارشات کی بنیاد پر علمی و عوامی حلقوں میں عرصہ دراز سے مسلسل تنقید کا نشانہ بنتی چلی آ رہی ہے۔ اس کونسل میں اگر کوئی دو چار مولویوں کو رکنیت فراہم بھی کی گئی تو وہ بھی علم و تقوی کو معیار بناتے ہوئے نہیں بلکہ خوشامد اور سیاسی وابستگیوں کی بنیاد پر وہ مجلس کے رکن بننے کے اہل ٹھہرے۔

۱۹۷۴ء میں پارلیمنٹ میں قادیانیوں کا مسئلہ اٹھایا گیا تو پارلیمنٹ نے دونوں فریقین کے دلائل سننے کے بعد چوتھا آئینی ترمیمی ایکٹ منظور کیا۔ اس ایکٹ کی رو سے قادیانیوں اور مرزا غلام احمد قادیانی کے دوسرے پیروکاروں کو قانونی اور آئینی طور پر غیر مسلم قرار دیا اور اس شخص کو آئینی طور پر مسلمان تسلیم کیا گیا جو محمد ﷺ کو آخری نبی مانتا ہو اور آپ ﷺ کے بعد کسی بھی ظلی یا بروزی نبوت کا قائل نہ ہو۔

۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاء الحق مرحوم نے مارشل لاء نافذ کرتے ہوئے ۱۹۷۳ء کے آئین کو معطل کر دیا۔ سپریم کورٹ نے جنرل مرحوم کی حکومت کو جائز قرار دیتے ہوئے ان کو دستور میں ترمیم کی بھی اجازت فراہم کر دی۔ اس اجازت کی وجہ سے اسلامی نظریاتی کونسل نے یہ تجویز پیش کی کہ جنرل مرحوم صاحب دستور میں ایسی ترمیم کر دیں جس کے ذریعے اعلی عدالتوں کو یہ اختیار مل جائے کہ وہ موجودہ قوانین کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھ سکیں۔ ڈاکٹر محمود غازی لکھتے ہیں:

"اسلامی نظریاتی کونسل کی تجاویز کو اصولی طور پر منظور کرتے ہوئے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے دستور میں ضروری ترامیم کر دیں اور ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء مطابق ۱۲ ربیع الاوّل ۱۴۰۰ھ کو ایک اہم دستوری ترمیم کے ذریعے یہ اختیار عدالتوں کو مل گیا۔"(۵۴)

مذکورہ بالا ترمیم کے نتیجے میں ۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو چاروں صوبوں کی ہائی کورٹس میں ایک شریعت بنچ اور سپریم کورٹ میں شریعت ایپلیٹ بنچ قائم کیا گیا۔ ان بنچوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی شہری کی درخواست پر کسی بھی ریاستی قانون کے بارے میں یہ جائزہ لے سکتے ہیں کہ وہ قرآن و سنت کے منافی ہے یا نہیں۔ یہ ایک بہت ہی مستحسن اقدام تھا لیکن جنرل مرحوم صاحب نے عدلیہ کو یہ اختیار کچھ استثناء ات کے ساتھ دیا جن میں سے چار مستقل اور ایک عارضی تھا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں: "جو چار مستقل استثناء ات تھے ان میں ایک تو خود آئین تھا، ایک پرسنل لا یعنی شخصی قوانین تھے، ایک استثناء پروسیجرل لاء کا تھا اور ایک مارشل لاء کے ریگولیشن تھے۔ جو عارضی استثناء تھا وہ مالیاتی قوانین کا تھا اور ابتداءً تین سال کے لیے کیا گیا تھا۔۔۔ ان پانچ استثناء کے علاوہ بقیہ تمام قوانین جن میں دیوانی قانون، فوجداری قانون اور قانون تجارت جیسے اہم شعبہ ہائے قانون شامل تھے، سب شریعت بنچوں کے دائرہ اختیار میں آ گئے اور اور ان پر شریعت بنچوں نے کام کرنا شروع کر دیا۔"(۵۵)

۱۰ فروری ۱۹۷۹ء کو جنرل ضیاء الحق مرحوم نے ایک حکم کے ذریعے حدود آرڈیننس جاری کیا جو جائیداد، زنا، قذف، امتناع اور سزائے تازیانہ سے متعلق تھا۔ بعد ازاں ۱۹۸۵ء میں اس وقت کی اسمبلی نے اس آرڈیننس کی توثیق کرتے ہوئے اسے آئینی تحفظ فراہم کیا۔ ان قوانین کے اطلاق میں پروسیجرل لاء (Procedural Law)، معاشرتی کرپشن اور بگاڑ کی وجہ سے بعض اوقات صحیح نتائج یا ثمرات حاصل نہ ہوئے تو بعض منفی ذہنیت کے عناصر ان قوانین کی منسوخی کے درپے ہو گئے۔ پیپلز پارٹی نے ان قوانین کی تنسیخ کے لیے تقریباً دو مرتبہ اسمبلی میں بل پیش کیا۔ بعض سیکولر سیاسی حلقوں اور حقوق

نسواں کی تنظیموں اور پرویز مشرف کی روشن خیال حکومت کی طرف سے ۲۱ اگست ۲۰۰۶ء کو 'فوجداری ترمیمی بل ۲۰۰۶ء' پیش کیا گیا۔ بعد میں اسی بل کا نام 'تحفظ خواتین بل ۲۰۰۶ء' رکھا گیا۔ ملک کے تمام معروف دینی حلقوں نے ان ترمیمات کی مخالفت کی اور ان کو اسلام کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔

شریعت بنچوں کے ایک سال تجربے سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ چار مختلف ہائی کورٹس میں چار شریعت بنچوں کی بجائے ایک مستقل عدالت قائم کر دی جائے جو چاروں ہائی کورٹس کی نمائندہ ہو۔ چنانچہ مئی ۱۹۸۰ء میں ایک وفاقی شرعی عدالت قائم کر دی گئی جس کا صدر دفتر اسلام آباد میں تھا۔ چاروں ہائی کورٹس سے ایک جج لیا گیا اور سپریم کورٹ کے ایک سابق جج اس عدالت کے سربراہ بنے۔ اسی دوران اس عدالت کی پانچ رکنی کمیٹی میں سے تین ججوں نے شادی شدہ زانی کے لیے رجم کے مسئلے میں جمہور علماء کا موقف سنے بغیر ایک شاذ رائے کی نمائندگی کرتے ہوئے اس کو خلاف شریعت قرار دیا۔ بعد ازاں عوامی و علمی حلقوں کے دباؤ کے پیش نظر تین جید علماء کو اس عدالت کا رکن بنایا گیا اور اس عدالت نے بہت سے قوانین کا علمی جائزہ لیا۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

> "۱۹۸۰ء میں اپنے قیام سے لے کر آج تک وفاقی شرعی عدالت نے سینکڑوں قوانین کا جائزہ لیا اور ان میں سے بہت سے قوانین کی جزوی ترامیم کا حکم دیا۔ حکومت کو مجبوراً وہ ترامیم کرنا پڑیں۔ یوں پاکستان میں سینکڑوں قوانین کو وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے اسلام کے مطابق بنایا جا چکا اور یہ اتنی بڑی کامیابی ہے جو پاکستان کے علاوہ کسی اور ملک میں حاصل نہیں کی جا سکی۔"(۵۶)

۲۰ جون ۱۹۸۰ء ہی میں جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ملک بھر میں زکوۃ و عشر آرڈیننس جاری کیا گیا۔ اس نظام کے تحت پورے ملک میں ۴۰ ہزار مقامی زکوۃ کمیٹیاں، چار صوبائی زکوۃ کونسلیں اور سینکڑوں ضلع و تحصیل زکوۃ کمیٹیاں تشکیل دی گئیں۔ اس نظام میں اگرچہ کئی ایک خرابیاں تھیں اور ابھی تک باقی ہیں لیکن اپنے مقاصد و اہداف کے اعتبار سے یہ ایک بہترین نظام تھا۔

۱۰ جولائی ۱۹۸۳ء میں سرکاری سطح پر ایک کمیشن قائم ہوا جو ملک کے نامور علماء، ماہرین قانون، اعلی عدالتوں کے ریٹائرڈ ججوں اور اہل قلم پر مشتمل تھا۔ اس کے صدر مولانا ظفر احمد انصاری تھے اور انہی کے نام پر اس کو 'انصاری کمیشن' کا نام دیا گیا۔ اس کمیشن نے ۵۴ کے قریب سفارشات صدر کو پیش کیں، جن میں سے چند ایک کو صدر نے منظور کر لیا۔ انہی سفارشات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ قرارداد مقاصد جو اب تک ۱۹۷۳ء کے آئین کے ایک دیباچے کی حیثیت رکھتی تھی، اس کو ایک ترمیم

کے ذریعے ۱۹۷۳ء کے آئین کا باقاعدہ حصہ بنا دیا گیا۔

۱۵ جون ۱۹۸۸ء جنرل ضیاء الحق مرحوم نے نفاذ شریعت آرڈیننس جاری کیا۔ یہ آرڈیننس چار ماہ کے لیے تھا اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۸ء کو اس کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی اس وقت کے قائمقام صدر جناب غلام اسحاق خان صاحب نے ایک 'نفاذ شریعت ترمیمی آرڈیننس' جاری کر دیا۔ یہ آرڈیننس بھی اپنی انتہائی مدت پوری کرتے ہوئے چار ماہ بعد از خود ختم ہو گیا۔

۱۷ مارچ ۱۹۹۷ء کو نافذ ہونے والا قصاص و دیت ایکٹ بھی نفاذ اسلام کے ہدف کی طرف ایک قابل قدر پیش رفت ہے۔ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں: ''یہ بات نہایت ہی افسوس ناک ہے کہ ۱۹۷۷ء سے پہلے کسی اسمبلی نے اسے ایکٹ بنا کر قانون کا درجہ نہیں دیا۔ پوری اینگلو سیکسن تاریخ میں یہ شاید پہلا اور واحد موقع تھا کہ ایک آرڈیننس کو جو درجنوں مرتبہ جاری کیا جا چکا تھا اسے ملک کی پارلیمنٹ نے اتنی طویل مدت تک منظور نہ کیا۔ ہر آرڈیننس کی مدت چار ماہ ہوتی ہے، اس دوران اگر پارلیمنٹ اسے منظور نہ کرے تو منسوخ ہو جاتا ہے۔ قصاص و دیت کا یہ آرڈیننس بار بار نافذ ہوتا رہا۔ ہر چار ماہ بعد جب بھی یہ منسوخ ہونے کے قریب آتا تو صدر ایک بار پھر اس آرڈیننس کو جاری کر دیتا۔۔۔ بالآخر Qisas and Diyat Act 1997 کے ذریعے اسے باقاعدہ اور مستقل قانون کا درجہ حاصل ہو گیا۔''(۵۷)

۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کو پاکستان کی سپریم کورٹ کے اپلیٹ بنچ نے متفقہ طور پر معاشرے میں جاری ہر طرح کے تجارت و صرفی لین دین کو قرآن و سنت سے متصادم ہونے کی وجہ سے حرام اور ناجائز قرار دیا۔ ڈاکٹر ظفر علی راجا لکھتے ہیں: ''سپریم کورٹ آف پاکستان کے شریعت اپلیٹ بنچ نے متفقہ طور پر قرار دیا کہ تجارتی و صرفی ہر طرح کے لین دین پر معاشرے میں جاری سود کی تمام اشکال قرآن و سنت سے متصادم ہونے کے باوصف حرام اور ممنوع ہیں۔ سپریم کورٹ نے یہ بھی قرار دیا کہ حکومتی سطح پر حاصل کردہ ملکی اور بین الاقوامی سودی قرضے بھی اسی ذیل میں آتے ہیں، لہٰذا ان کا چلن بھی اسلامی تعلیمات کی رو سے ناجائز ہے۔ سپریم کورٹ نے اپنے فیصلے میں حکومت کو ہدایت کی ہے کہ وہ آٹھ سودی قوانین کو مارچ ۲۰۰۰ء تک تبدیل کر کے قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھال لے جبکہ بقایا تمام سودی قوانین کو ختم یا تبدیل کرنے کے لیے ۳۰ جون ۲۰۰۱ء تک کی مہلت دے دی گئی ہے۔''(۵۸)

لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ اس وقت کی آمرانہ اور روشن خیال حکومت نے اس سلسلے میں

حیلے بہانوں اور ٹال مٹول سے کام لیا اور تاحال اس بارے میں بعد ازاں عملاً کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔

حوالہ جات وحواشی

۱۔ ھیئۃ کبار العلماء، أبحاث ھیئۃ کبار العلماء، إدارات البحوث العلمیۃ والإفتاء والدعوۃ والإرشاد، المملکۃ العربیۃ السعودیۃ، ۳/ ۱۶۵۔۱۶۶

۲۔ أیضاً ۳۔ أیضاً ۴۔ أیضاً ۵۔ أیضاً

۶۔ عبد الرحمن عبد العزیز القاسم شیخ، الإسلام وتقنین الأحکام في البلاد السعودیۃ، مطبعۃ المدني، الطبعۃ الأولی، ۱۹۶۶ء، ص ۲۳۹۔۲۴۰

۷۔ أبحاث ھیئۃ کبار العلماء: ۳/ ۱۵۷

۸۔ أیضاً: ۳/ ۱۵۸ ۹۔ أیضاً: ص ۱۵۸۔۱۵۹

۱۰۔ محمد طاہر منصوری و عبد الحیئ ابڑو، امام أبو حنیفہ حیات، فکر اور خدمات، مطبع ادارۃ تحقیقات اسلامیۃ، بین الأقوامی اسلامیہ یونیورسٹی، اسلام آباد، ۲۰۰۲ء، ص ۲۰۱

۱۱۔ أیضاً: ص ۱۷۳۔۱۷۴

۱۲۔ مجموعہ علماء، اردو دائرۃ معارف اسلامی، دانش گاہ پنجاب، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ۱۸/ ۵۸۵

۱۳۔ امام أبو حنیفہ حیات، فکر اور خدمات: ص ۱۷۳۔۱۷۴ ۱۴۔ اردو دائرۃ معارف اسلامیۃ: ۱۸/ ۵۸۶

۱۵۔ عبد القیوم جالندھری مفتی سید، قوانین اسلامی ممالک، ناشر مدیر ادارہ علم و عمل، لائل پور، ص ۷۶

۱۶۔ صبحی محمصانی ڈاکٹر، فلسفہ شریعت اسلام، مولوی محمد احمد رضوی (مترجم)، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۱۱۔۱۱۳

۱۷۔ الإسلام وتقنین الأحکام في البلاد السعودیۃ: ص ۲۴۹

۱۸۔ فلسفہ شریعت اسلام: ص ۱۱۰

۱۹۔ الإسلام وتقنین الأحکام فی البلاد السعودیۃ: ص ۲۴۹

۲۰۔ قوانین اسلامی ممالک: ص ۷۷

۲۱۔ الإسلام وتقنین الأحکام فی البلاد السعودیۃ: ص ۲۴۶ ۲۲۔ أیضاً: ص ۲۴۶

۲۳۔ فلسفہ شریعت اسلام: ص ۱۱۰۔۱۱۱ ۲۴۔ قوانین اسلامی ممالک: ص ۷۶

۲۵۔ أبحاث ھیئۃ کبار العلماء: ۳/ ۱۶۳ ۲۶۔ أیضاً

۲۷۔ أیضاً ۲۸۔ أیضاً

۲۹۔ الزرقاء، مصطفی أحمد ڈاکٹر، المدخل الفقھی العام، دار الفکر، بیروت، طبعۃ تاسعۃ، ۱۹۶۷ء، ۱/ ۲۰۹۔۲۱۰

۳۰۔ أیضاً: ۱/۲۰۸۔۲۰۹

۳۱۔ أبحاث ھیئۃ کبار العلماء: ۳/ ۱۶۴ ۳۲۔ أیضاً ۳۳۔ أیضاً

۳۴۔ أیضاً: ص ۱۶۵ ۳۵۔ أیضاً: ۳/ ۱۶۴

۳۶۔ فلسفہ شریعت اسلام: ص ۱۱۸ ۳۷۔ قوانین اسلامی ممالک: ص ۷۹

۳۸۔ عرفان خالد ڈھلوں، ڈاکٹر، علم اصول فقہ ایک تعارف، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامییونیورسٹی، اسلام آباد، پاکستان، طبع اول، ۲۰۰۶ء، ۳/ ۱۵۵

۳۹۔ قوانین اسلامی ممالک: ص ۱۵۷ ۴۰۔ علم اصول فقہ ایک تعارف: ۳/ ۱۵۶

۴۱۔ أیضاً: ص ۱۵۷ ۴۲۔ أیضاً: ص ۱۵۷۔۱۵۸

۴۳۔ عبد الرحمن بن سعد الشثری، تقنین الشریعۃ بین التحلیل والتحریم، المکتبۃ الشاملۃ، الإصدار الثالث، ص ۷

۴۴۔ علم اصول فقہ ایک تعارف: ۳/ ۱۸۸

۴۵۔ تنزیل الرحمن جسٹس (ر)، مجموعہ قوانین اسلام، ادارہ تحقیقات اسلامیہ، اسلام آباد، پاکستان، اشاعت پنجم، ۲۰۰۴ء، ۱/ ۱۵۔۱۶

۴۶۔ علم اصول فقہ ایک تعارف: ۳/ ۱۹۵، ۱۹۶ ۴۷۔ أیضاً: ص ۱۹۹

۴۸۔ مجموعہ قوانین اسلام: ۱/ ۱۶ ۴۹۔ علم اصول فقہ ایک تعارف: ۳/ ۲۰۷

۵۰۔ أیضاً: ص ۲۰۸ ۵۱۔ مجموعہ قوانین اسلام: ۱/ ۱۷

۵۲۔ محمد امین ڈاکٹر، عصر حاضر اور اسلام کا نظام قانون، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۹ء، ص ۱۷۹

۵۳۔ علم اصول فقہ ایک تعارف: ۳/ ۲۱۱۔۲۱۲ ۵۴۔ أیضاً: ص ۲۱۳

۵۵۔ أیضاً: ۲۱۴۔۲۱۵ ۵۶۔ أیضاً: ص ۲۲۲ ۵۷۔ أیضاً: ص ۲۳۱

۵۸۔ ظفر الحق، راجا، سود کی عدالتی ممانعت کے بعد، ماہنامہ محدث، فروری ۲۰۰۰ء، مجلس تحقیق اسلامی، لاہور، ص ۳